مذاہب اربعہ: ضرورت واہمیت

تقلید شخصی کی ضرورت واہمیت اور منکرین تقلید کی مخالفت ومغالطہ انگیزی کے معروضی تجزیے

پر مبنی علامہ ابن رجب حنبلی کی شاہکار تحریر "**الرد علی من اتبع غیر المذاہب الاربعة**" کا اردو ترجمہ

تصنیف لطیف

حضرت علامہ حافظ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب حنبلی

(۷۳۶ھ/۷۹۵ھ)

ترجمہ وتخریج

میزان الرحمٰن علائی

پیش لفظ

''مذاہب اربعہ: ضرورت واہمیت'' آٹھویں صدی ہجری کے معروف محدث، محقق اور لاجواب فقیہ حضرت علامہ حافظ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب حنبلی (۷۳۶ھ/۷۹۵ھ) کی کتاب'' **الــرد علی من اتبــع غیر الـــمذاهب الأربعة** '' کا اردو ترجمہ ہے۔ راقم سطور نے یہ ترجمہ آج سے تقریباً آٹھ نو سال پہلے مکمل کیا تھا تاہم دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس ترجمے کی طرف پھر کبھی توجہ مبذول نہیں ہوسکی، یوں یہ ترجمہ ایک دہائی سے کچھ کم عرصے تک لیپ ٹاپ کے کسی گوشے میں پڑا رہا۔ ابھی کئی روز پہلے کچھ احباب نے اصرار کیا کہ اگلے سنڈے کے کلاس میں ''مذاہب اربعہ کی معنویت اور ضرورت'' پر ضرور کچھ روشنی ڈالیں، کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک اور پھر صحابہ کرام کے زمانے میں تو مذہب ایک ہی تھا، پھر دور مابعد میں یہ الگ الگ مذاہب کہاں سے پیدا ہوگئے اور آخر ان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کی یہ بات سن کر فوراً میرا ذہن اس ترجمے کی طرف گیا جو برسوں سے توجہ کا منتظر تھا۔ میں نے ترجمے پر ایک نظر ڈالی اور آج مؤرخہ ۳۱/ اکتوبر ۲۰۲۱ء بروز اتوار اسی عنوان کو اپنے ہفتہ واری کلاس کا موضوع بنایا۔ الحمدللہ! کلاس میں شامل سارے لوگ مطمئن ہوگئے اور انہیں مذاہب اربعہ کی ضرورت واہمیت خوب اچھی طرح سمجھ میں آگئی۔ امید ہے کہ یہ تمام لوگ آئندہ اس تعلق سے کسی بدگمانی یا بہکاوے کے شکار نہیں ہوں گے۔ چوں کہ مذاہب اربعہ کی معنویت وقت کا ایک سلگتا ہوا عنوان ہے اس لئے میں نے خیال کیا کہ جب اس ترجمہ کو طباعت کے مرحلے سے گزرنا ہوگا تب گزرے گا تاہم فوری طور اس کا ''پی ڈی ایف'' بنادیا جائے تاکہ اردو داں طبقہ امام ابن رجب حنبلی کے اس علمی شاہکار سے اب مزید کسی تاخیر کے بغیر خود کو مستفید کرسکے۔

اگر اس کتاب سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو درود شریف اور سورہ فاتحہ پڑھ کر ان کا ثواب حضرت مصنف رحمہ اللہ تعالی کی روح مبارک کو ایصال کریں اور ساتھ ہی اِس ہیچ مداں مترجم اور اس کے اہل خانہ کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں۔ والسلام

میزان الرحمٰن علائی

حال مقیم: ہٹ بے، جزیرہ انڈمان

۳۱/ اکتوبر ۲۰۲۱ء مطابق ۲۴/ ربیع الاول ۱۴۴۳ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

وبه نستعين

الحمد لله رب العالمين ، حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه كما يحب ربنا و يرضى ،وصلى الله على محمد عبده و رسوله،النبى الأمى خاتم النبيين وامام المتقين،المبعوث بالدين القيم، والشريعة الباقية المؤيدة المحفوظة، الذى لايزال من امته طائفة ظاهرين على الحق لايضرهم من خذلهم حتى تقوم الساعة۔

أما بعد!

معتبر ذرائع کے مطابق ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے امام احمد بن حنبل اور دیگر مشہور آئمہ مذاہب[1] کے متبعین کے خلاف ایک نظریاتی محاذ قائم کرلیا ہے اور احکام ومسائل میں وہ لوگ ان آئمہ کے مذاہب سے اختلاف کرتے ہوئے کافی دور نکل چکے ہیں، حالانکہ ان آئمہ یا ان کے متبعین کے خلاف محاذ آرائی کسی بھی طور پر روانہیں؛ کیونکہ جن ہستیوں نے اس ''قضیہ تقلید'' کی بنیاد رکھی ہے وہ یا تو خود حق کی اتباع کرنے والے مجتہد فی الشرع تھے یا پھر کسی دوسرے مجتہد کے مقلد تھے، اس لئے ان قابل احترام ہستیوں کی مخالفت وعداوت بہر حال ایک نا قابل قبول اقدام ہے۔

پیش نظر قضیہ کے تعلق سے میں اب یہاں کچھ معروضات پیش کررہا ہوں۔توفیق کی امید اللہ ہی سے ہے، وہی میرا معین ہے،اسی پر میرا بھروسہ ہےاوراس کے سوا کوئی طاقت وقوت نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالی نے امت مرحومہ کیلئے ''دین مصطفیٰ'' صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح محفوظ و مامون کردیا ہے اُس کی مثال ادیان سابقہ میں نہیں ملتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ امم سابقہ میں جب کبھی کسی پیغمبر کا دین رو بہ زوال ہوا تو خاکدان گیتی پر ایک دوسرے نبی نے تشریف لاکر اس جاں بلب دین کو سہارا دیا اور اس کے مردہ عروق میں زندگی کی نئی روح پھونک دی لیکن چونکہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پھر کوئی ایسا نبی نہیں آنے والا تھا جو دین محمدی میں تجدید وانتشار کی صورت میں گزشتہ پیغمبروں کے ادیان کی طرح ''دین محمدی'' کی بھی تجدید واحیا کردے اس

1۔امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (وفات:۱۵۰ھ)، امام مالک بن انس (وفات:۱۷۹ھ) اور امام محمد بن ادریس شافعی (وفات:۲۰۳)۔

لئے اللہ سبحانہ وتعالی نے اس دین کی حفاظت کا معاملہ خود اپنے ذمہ کرم پر لے لیا اور اسے ہر زمانے کیلئے ایک ایسی مہم بنادی جس سے تمام سرکشوں کی تمام تر تحریفی سرگرمیاں، باطلوں کا فساد اور جاہلوں کی تاویل فنا ہو کر رہ جائے۔

چنانچہ اپنے کلام مجید کو اساس بنا کر دین محمدی کے تحفظ کی ضمانت دیتے ہوئے اللہ تعالی نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون﴾ [سورہ: الحجر، پارہ:۱۴، رکوع:۱، آیت:۹] بے شک قرآن کو ہم نے ہی نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس آیت کریمہ میں جب اللہ تعالی نے اپنی کتاب کے تحفظ وبقا کی ضمانت دے دی تو اب کسی بھی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ قرآن کے الفاظ میں کچھ بھی زیادتی یا کمی کر سکے۔ تاہم چوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار بوڑھے مرد بھی تھے، بوڑھی عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے، بچیاں بھی تھیں اور ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے کبھی کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں تھیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تعلیم وتحفیظ میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ان کے لئے ''احرف سبعہ'' [1] یعنی سات لہجوں میں قرآن پڑھنے کی رخصت طلب کی، جیسا کہ

1۔ ''احرف'': یہ حرف کی جمع ہے اور حرف کا معنی لغت میں ''وجہ اور کنارہ'' وغیرہ کے آتا ہے لیکن اصطلاح میں ''احرف سبعہ'': نزول قرآن کے ان سات طرق کو کہتے ہیں جو الفاظ میں تو مختلف ہیں لیکن معنی میں متفق یا متقارب ہیں۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں ایک اہم نکتے کی جانب توجہ دلاتے چلیں کہ قرآن کریم کے ''احرف سبعہ'' سے قراء سبعہ یعنی نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم مدنی (م:۱۶۹ھ)، عبداللہ بن کثیر الداری مکی (م:۱۲۵ھ)، عاصم بن ابی النجود کوفی (م:۱۲۷ھ)، عبداللہ بن عامر بن یزید شامی (م:۱۱۸ھ) حمزہ بن حبیب الزیات کوفی (م:۱۸۸ھ)، ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی کوفی (م:۱۸۹ھ) اور ابوعمرو زبان بن العلا بصری (م:۱۵۴ھ) کی مروجہ قرأتیں ہرگز بھی مراد نہیں ہیں جو معروف اصطلاح میں قرأت سبعہ کہلاتی ہیں۔ قابل غور بات ہے کہ قرأت سبعہ کی تحدید تو کافی زمانے کے بعد امام ابن مجاہد بغدادی (م:۳۲۴ھ) نے کی ہے جبکہ ''احرف سبعہ'' نزول قرآن کے بنیادی طریق رہے ہیں۔

تفصیل یہ ہے کہ شروع میں قرآن صرف ایک ہی حرف (لہجے) پر نازل ہوا لیکن آقا علیہ الصلوۃ والسلام اپنی امت کی سہولت کیلئے حضرت جبرئیل امین سے زیادہ کا مطالبہ کرتے رہے حتی کہ جبرئیل امین نے آپ کو سات لہجوں میں قرآن پڑھایا۔ یہی سات لہجے احرف سبعہ کہلاتے ہیں۔

ابی بن کعب [1] وغیرہ کی روایت سے ثابت ہے۔ بعدازاں، جب اسلام اطراف و اکناف میں پھیل گیا اور مسلمان دور دراز شہروں میں منتشر ہوگئے تو اُن میں سے ہر جماعت نے قرآن کو اُسی لہجے (حرف) پر پڑھنا شروع کر دیا جو اُن تک موصول ہوا تھا۔ اِس طرح قرآن کے معاملے میں کافی زیادہ اختلافات [2] رونما ہونے لگے۔ حالات کے مدنظر

1۔ ترمذی میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **قال: لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل، فقال: یا جبرئیل! انی بعثت الی امۃ امیین منھم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریۃ والرجل الذی لم یقرأ کتاباقط قال یامحمد! ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف** ۔(سنن ترمذی، ابواب القرأت، باب ماجاء ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف)

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبرئیل سے ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا: جبرئیل! میں ایک ایسی امت کی طرف بھیجا گیا ہوں جو اَن پڑھ ہے، ان میں بوڑھے بھی ہیں، عمر رسیدہ بھی ہیں، بچے بھی ہیں، بچیاں بھی ہیں اور وہ شخص بھی ہے جس نے کبھی کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں۔ جبرئیل نے کہا، اے محمد! علیہ السلام؛ بیشک قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالی عنھما سے مروی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال، اقرأنی جبرئیل علی حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ ویزیدنی حتی انتھی الی سبعۃ احرف** (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف)

ترجمہ: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جبرئیل نے ایک حرف پر قرآن پڑھایا تو میں نے ان کی طرف مراجعت کی اور مزید طلب کرتا رہا اور وہ (حروف قرآن میں) اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ اضافے کا یہ سلسلہ سات حرفوں پر منتہی ہوا۔

2۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **ان حذیفۃ بن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اھلَ الشام فی فتح ارمینیۃ واٰذربیجان مع اھل العراق فافزع حذیفۃ اختلافُھم فی القراءۃ فقال حذیفۃ لعثمٰن یا امیر المؤمنین ادرک ھٰذہ الامۃ قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیھود والنصاری فارسل عثمٰن الی حفصۃ ان اَرسلی الینا بالصُّحُف ننسخھا فی المصاحف ثم نردھا**

الیک فارسلت بھا حفصۃُ الی عثمٰن فامر زید بن ثابت وعبد اللہ بن زبیر وسعید بن العاص وعبد الرحمن بن الحارث بن ھشام فنسخوھا فی المصاحف وقال عثمٰن للرھط القرشیین الثلٰثۃ اذا اختلفتم انتم و زید بن ثابت فی شیٔ من القراٰن فاکتبوہ بلسان قریش فانما نزل بلسانھم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمٰن الی حفصۃ وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامربما سواہ من القراٰن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن)

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن یمان حضرت عثمان کے پاس آئے، اس وقت حضرت حذیفہ اہل عراق کے ساتھ مل کر ارمینیہ اور آذر بائیجان کی فتح کیلئے اہل شام کے ساتھ جہاد کر رہے تھے۔ دراصل قرأت قرآن کے تئیں لوگوں کے اختلافات نے حضرت حذیفہ کو خوف وتشویش میں مبتلا کر دیا تھا، اس لئے انہوں نے حضرت عثمان سے کہا: اے امیر المومنین! قبل اس کے کہ یہ امت بھی یہود ونصاری کی طرح کتاب اللہ میں اختلاف کر بیٹھے، آپ اس امت کیلئے تدارک کی کوئی راہ نکالئے۔ حضرت عثمان نے اُن کی بات سن کر حضرت حفصہ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ آپ وہ صحیفے (وہ اوراق جن میں عہد صدیقی میں قرآن کو جمع کیا گیا تھا) ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم ان کے موافق مصاحف لکھیں گے، پھر انہیں آپ کے پاس واپس بھیج دیں گے۔ حضرت حفصہ نے وہ تمام صحف حضرت عثمان کے پاس بھیج دیئے۔ حضرت عثمان نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو ان صحف کے نقل کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ ان حضرات نے ان تمام صحیفوں کو مصاحف میں نقل کیا۔ حضرت عثمان نے تینوں قریشی حضرات سے کہا: اگر لغات قرآن میں کسی جگہ تم میں اور زید میں اختلاف ہوجائے تو وہاں لغت قریش کے مطابق لکھنا کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، چنانچہ ان سب نے اس بات پر عمل کیا اور جب مصاحف میں صحیفے نقل کئے جا چکے تو حضرت عثمان نے ان صحیفوں کو تو حضرت حفصہ کے پاس بھیج دیا (جو عہد صدیقی کی یادگار تھے اور جنہیں حضرت عثمان نے نقل پذیری کی غرض سے منگوایا تھا، تاہم نو پیراستہ) مصاحف جو نقل شدہ تھے، کا ایک ایک نسخہ ہر جگہ بھیج دیا۔ اور ساتھ ہی انہوں نے یہ حکم بھی جاری کردیا کہ ان مصاحف کے علاوہ ہر اُس مصحف یا صحیفہ کو جلا دیا جائے جس میں قرآن لکھا ہوا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی (متوفی: ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں بخاری، بیہقی اور حاکم کے

عہد عثمانی میں صحابہ کرام نے اس خوف سے کہ کہیں یہ امت بھی امم سابقہ کی طرح اپنی کتاب میں اختلاف نہ کر بیٹھے ،سارے مسلمانوں کوایک لہجہ پر جمع کیا اور اُس ایک تعین کردہ لہجے کے علاوہ (دیگر لہجوں پر مشتمل) تمام نسخوں کو جلا دیا۔ اور یہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک ایسا حوصلہ مندانہ اقدام تھا جس کی مدح سرائی حضرت علی ،حضرت خذیمہ ودیگر تمام اجلہ صحابہ نے کی۔

غور سے دیکھا جائے تو حضرت عمر (رضی اللہ تعالی عنہ) نے جو عہد رسالت میں حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ تعالی عنہ سے ''اشدالانکار'' والی آیت میں اختلاف [1] کیا، یونہی حضرت ابی بن کعب (رضی اللہ تعالی عنہ) کا

حوالے سے بیان کیا ہے کہ قرآن کے جمع وترتیب کا عظیم الشان کام تین مرحلوں میں انجام پذیر ہوا ہے۔ پہلا مرحلہ: عہد رسالت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں، جیسا کہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت انصاری سے مروی ہے۔دوسرا مرحلہ: حضرت فاروق اعظم کی تحریک وترغیب پر عہد صدیقی میں جس کے بارے میں امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت زید بن ثابت انصاری ہی سے ایک روایت نقل کی ہے۔اور تیسرا مرحلہ: ترتیب سور کے حوالے سے عہد عثمانی میں، جس کی قدرے تفصیل حضرت حذیفہ بن یمان والی روایت کے تحت کچھ دیر قبل گزر گئی۔ (ملخص: از: النوع الثامن عشر، الاتقان فی علوم القرآن، امام جلال الدین سیوطی)

1۔امام بخاری اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں: **حدثنا سعيد بن عفير قال حدثني الليث قال حدثني عقيل عن ابن شهاب قال حدثني عروة بن الزبيران المسوربن مخرمة وعبد الرحمن بن عبد القاری حدثاه انهماسمعاعمربن الخطاب يقول : سمعت هشام بن حكيم بن حزام يقرأ سورة الفرقان فی حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستمعت لقرائته فاذا هو يقرأ على حروف كثيرة لم يقرئنيها رسول الله صلى الله عليه وسلم فكدت اساوره فی الصلوة فتصبرت حتى سلم فلببته بردائه فقلت من اقرأک هذه السورة التی سمعتک تقرأ ؟ قال: اقرأنيها رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت: كذبت فان رسول الله عليه وسلم قد أقرأنيها على غير ما قرأت، فانطلقت به اقوده الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: انی سمعت هذا يقرأ بسورة الفرقان على حروف لم تقرئنيها ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ارسله ، اقرأ يا هشام . فقرأ عليه القرائة التی سمعته يقرأ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : كذلک انزلت ، ثم**

واقعہ[1] پیش آیا، وہ دراصل قرآن میں اختلاف حروف ہی کی وجہ سے پیدا شدہ شک کا نتیجہ تھا۔مزید یہ کہ کچھ کاتبان

قال : اقرأ یا عمر ، فقرأت القرائة التی اقرأنی ، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : کذلک انزلت ، ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ماتیسر منه ۔(صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن ،باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف)

ترجمہ:ہمیں سعید بن عفیر نے حدیث بیان کی،انہوں نے کہا: مجھے اللیث نے حدیث بیان کی،انہوں نے کہا: مجھے عقیل نے ابن شہاب سے حدیث بیان کی،انہوں نے کہا: مجھے عروہ بن زبیر نے حدیث بیان کی،کہ حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عبدالقاری نے حضرت عمر بن خطاب کو کہتے ہوئے سنا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان پڑھتے سنا۔ میں نے جب ان کی قرأت بغور سنی تو کیا پایا کہ وہ سورت کو بہت سے ایسے حروف کے ساتھ پڑھ رہے ہیں جو اللہ کے رسول نے مجھے نہیں پڑھایا تھا۔قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر جھپٹ پڑتا تاہم میں نے صبر کیا یہاں تک کہ انہوں نے سلام پھیر دیا۔پھر میں نے ان کو ان کی چادر سے کھینچا اور پوچھا کہ تمہیں یہ سورت کس نے پڑھائی ہے؟انہوں نے جواب دیا کہ: مجھے یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی ہے۔میں نے ان سے کہا کہ:تم جھوٹ کہتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ سورت اس کے علاوہ پڑھائی ہے جو تم پڑھ رہے ہو پھر میں ان کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور کہا (یارسول اللہ!) میں نے ان کو سورہ فرقان ایسے حروف کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا ہے جن حروف کے ساتھ آپ نے مجھے یہ سورت نہیں پڑھائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے چھوڑ دو،(پھر ان سے فرمایا) ہشام! تم پڑھو۔تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی وہی قرأت پڑھی جسے میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سورت اسی طرح نازل کی گئی ہے۔پھر فرمایا: عمر! تم پڑھو۔تو میں نے وہ قرأت پڑھی جو انہوں نے مجھے سکھائی تھی،اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ سورت اسی نازل کی گئی ہے (پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) بیشک یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے،جو تمہیں آسان لگے،پڑھو۔

1۔صحیح مسلم میں ہے: **عن ابی بن کعب قال کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرأ قراءة أنکرتها علیه ثم دخل اٰخر فقرأ قراءةً سوٰی قراءةِ صاحبه فلما قضینا الصلوٰة دخلنا جمیعا علی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت ان هٰذا قرأ قراءةً انکرتها علیه ودخل اٰخر فقرأ قراءةً**

وحی ایسے بھی تھے جن کے دل میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا، چنانچہ ایسے لوگوں نے اسلام سے روگردانی کی اور مرتد ہوگئے؛ یہاں سوچنے والی بات ہے کہ یہ تمام تر واقعات عہد نبوی ہی میں پیش آئے تو اگر لغات قرآن کے سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان رائج اختلافات کو ختم نہ کر کے حسب سابق ہی باقی رہنے دیا جاتا تو آگے چل کر امت مسلمہ کا

سوی قراء ةِ صاحبه فامرهما رسول الله صلى الله عليه وسلم فقرآ ،فحسن النبى صلى الله عليه وسلم شانهما فسقط فى نفسى من التكذيب ولا اذ كنتُ فى الجاهلية فلمارای رسول الله صلى الله عليه وسلم ماقد غشينى ضرب فى صدرى ففضتُ عرقا وكانما انظر الى الله تعالى فرقًافقال لى : يا ابى ! اُرسِل الى ان اقرأ القران على حرف فرددت اليه ان يهون على امتى فرد الى الثانية تقرأه على حرفين فرددت اليه ان يهون على امتى فرد الى الثالثة اقرأه على سبعة احرف ۔(صحیح مسلم، کتاب: فضائل القرآن وما یتعلق بہ۔ باب: بیان ان القران انزل علی سبعۃ احرف)

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوکر نماز پڑھنے لگا اور اس نے نماز میں قرآن کی ایک ایسی قرأت کی جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے پہلے شخص کی قرأت سے بھی الگ تھلگ ایک قرأت کی۔ جب ہم نے نماز ختم کر لی تو ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ میں نے عرض کیا (یارسول اللہ!) اس شخص نے قرآن مجید کی ایک ایسی قرأت کی ہے جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر دوسرا شخص آیا تو اس نے پہلے کی بھی قرآت کے علاوہ ایک الگ قرأت کی ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا تو ان دونوں نے پڑھا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو صحیح قرار دیا جس سے میرے دل میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) تکذیب کے ایسے وسوسے آنے لگے کہ جاہلیت میں بھی ایسے خیالات نہیں آئے تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت دیکھی تو میرے سینے پر ہاتھ مارا جس سے میں پسینے میں بھیگ گیا اور خوف الٰہی کی وجہ سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: اے ابی! اللہ نے میرے پاس پیغام بھیجا کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ! میری امت پر آسانی فرما۔ تو اللہ نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں قرآن کو دو حرفوں پر پڑھوں۔ میں نے پھر درخواست کی کہ میری امت پر آسانی فرما، تو اللہ تعالی نے تیسری بار پیغام بھیجا کہ میں اسے سات حرفوں (لغات) پر پڑھوں۔

کیا حال ہوتا؟ اسی وجہ سے جمہور علماء امت نے حضرت عثمان کے تدوین کردہ نسخہ کے علاوہ دیگر تمام نسخوں کو منسوخ قرار دیا اور مسلمانوں کو ان سے روکا، تاہم علماء کرام کی ایک جماعت نے ان نسخوں کی بھی اجازت دی ہے۔ بتاتے چلیں کہ یہاں پر امام احمد اور امام مالک کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ آیا متروکہ حروف کے ساتھ تلاوتِ قرآن مؤخر الذکر گروہ علما کے نزدیک داخل نماز و خارج نماز دونوں صورتوں میں جائز ہے یا صرف خارج نماز کی صورت میں؟

بہر حال! اگر کسی شخص نے مثلاً عبداللہ ابن مسعود کے حرف پر قرآن پڑھا یا کسی دوسرے ایسے حرف کے ساتھ قرآن کی تلاوت کی جو اس مجتمع علیہ مصحف کا مخالف ہو اور ساتھ ہی یہ دعوی کرے کہ یہ حرف جس کے ساتھ اس نے قرآن کو پڑھا ہے، یہی زید بن ثابت کا حرف ہے اور اسی پر حضرت عثمان نے امت کو جمع کیا تھا یا یہ عوی کرے کہ میرا پڑھا ہوا حرف زید بن ثابت کے حرف سے افضل ہے تو وہ شخص یقیناً ظالم، سرکش اور عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا لیکن اس سے امت کے درمیان اختلاف رونما نہیں ہوگا، کیونکہ اس طرح کے بدیہی معاملے میں کہیں بھی دو مسلمان آپس میں اختلاف نہیں کریں گے۔ ہاں! محل اختلاف تو تب ہے کہ مثلاً کسی شخص نے عبداللہ ابن مسعود یا اُن جیسے کسی دوسرے کے حرف پر قرآن کو پڑھا اور ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا کہ مثلاً یہ ابن مسعود کا حرف ہے؛ تب البتہ یہ اختلاف کا محل ہوگا۔

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگ قرن اول میں احادیث کو بھی اسی طرح اپنے سینے میں محفوظ رکھتے تھے جس طرح قرآن کو رکھتے تھے۔ کچھ علما کے ہاں مصحف کی طرح احادیث کو بھی لکھ کر محفوظ کر لینے کی روش تو تھی تاہم بعض دوسرے علما کتابتِ احادیث سے منع بھی فرماتے تھے، اب اس میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں کہ حفظ اور ضبط کے سلسلے میں لوگوں کا ذہنی معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ کسی کی یادداشت مضبوط ہوتی ہے تو کسی کی کمزور۔ پھر دور صحابہ کے بعد اہل بدعت وضلالت کی ایک ایسی جماعت بھی ظاہر ہوئی جس نے دین میں وہ باتیں بھی شامل کر دیں جو قطعًا دین کا حصہ ہی نہیں تھیں؛ مزید یہ کہ ان بدعتیوں اور گمراہوں نے اپنی گستاخانہ جسارت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دھڑلے سے جھوٹ باندھا۔ اس وقت اللہ تعالی نے اپنی حکمت بالغہ سے حفظ احادیث کیلئے ایسے کثیر افراد پیدا فرمائے جنہوں نے اہل بدعت کے تمام جھوٹ، وہم اور غلط بیانی کو چھان چھان کر احادیث صحیحہ سے الگ کر دیا۔ ان مقدس لوگوں نے احادیث کا خوب خوب دورہ کیا اور انتہائی مضبوطی کے ساتھ حدیثیں یاد کر لیں، پھر علما نے علم حدیث میں کتابیں لکھنا شروع کیں، اپنی اپنی تالیفات کو نشر کیا اور

لوگوں کو بڑھ چڑھ کر حدیثیں سکھائیں؛ تاہم صحیح حدیث کے سلسلے میں بنیادی طور پر دو اماموں کی کتابوں پر لوگوں کا اعتماد قائم ہو گیا۔ ان میں سے ایک امام بخاری کی صحیح بخاری پر، اور دوم امام مسلم بن حجاج قشیری کی صحیح مسلم پر۔ ان دو کتابوں کے بعد بقیہ کتب ستہ یعنی سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ پر لوگوں کا اعتماد بحال ہوا۔

شیخین (امام بخاری، امام مسلم) کی صحاح کے بعد باب صحیح میں اور بھی کئی تصنیفات معرض وجود میں آئیں لیکن انہیں شیخین کی کتابوں کا درجہ نہیں مل پایا، بلکہ بعض علما نے تو اُن سے اختلاف بھی کیا جنہوں نے اپنی کتاب کے حوالے سے شیخین سے استدراک کیا اور اپنی کتاب کا نام "المستدرک" رکھا۔ بعض حفاظ نے تو اس سلسلے میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ "مستدرک" میں کوئی بھی حدیث شیخین کی شرطوں پر صحیح ہی نہیں ہے، تاہم بعض دوسرے حضرات نے اس بات کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، مستدرک میں بہت سی حدیثیں صحیح ہیں۔ البتہ تحقیق یہ ہے کہ اس میں بہت سی احادیث صحیح تو ہیں لیکن وہ شیخین کی شرطوں پر نہیں بلکہ وہ امام ابو عیسی وغیرہ کی شرطوں پر صحیح ہیں، اور اگر شیخین ہی کی شرطوں کو بنیاد بنا کر بات کی جائے تو ان شرائط کے مطابق مستدرک کی احادیث درجہ صحت کو نہیں پہنچ پاتیں۔ معلوم ہونا چاہئے کہ شیخین نے تقریباً جو بھی حدیث چھوڑی ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی علت خفیہ ضرور موجود ہے، تاہم اس کے لئے عزت وشرف ہے جس نے احادیث کی معرفت کے ساتھ ساتھ علل احادیث کو بھی پہچانا اور تحقیق کی کسوٹی پر کامیابی کے ساتھ ان کی جانچ پڑتال کی۔

زمانہ قدیم ہی سے لوگوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ حدیث کیلئے امام بخاری اور امام مسلم کی صحیحین ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں تو گویا اس معاملے میں لوگوں کا ان پر کلی اعتماد قائم ہو چکا ہے۔ پھر ان دونوں کے بعد مذکورہ بالا بقیہ چار کتابوں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) پر اعتماد کی بنیاد رہی ہے۔ یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ ان کتابوں کے ذریعے احادیث کی صحت وضعف واضح ہو جانے کے بعد اب اس حوالے سے صرف اور صرف ایسے شخص کی رائے قابل قبول ہوگی جو حدیث دانی اور احادیث کی مہارت ومعرفت میں حد درجہ مشہور ہو چکا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ بہت ہی کمیاب ہیں۔ اور رہی بات عوام الناس کی، تو وہ مذکورہ بالا کتب احادیث پر عمل کرتے ہیں اور ان کی طرف احادیث کی نسبت کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

احکام شریعت یعنی حلال وحرام کے مسائل کو اساس بنا کر اگر بات کی جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسائل

شرع کے حوالے سے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں بھی بہت زیادہ اختلافات رونما ہوئے، بلکہ ابتدائی زمانوں میں تو یہ حال تھا کہ ہر وہ شخص جو علمی لیاقت اور دینداری میں مشہور ہوتا وہ مسائل کے سلسلے میں اپنی صوابدید کے مطابق فتوی دے دیتا؛ تاہم، باوجود علما کے عام موقف سے ہٹ کر فتوی جاری کرنے کے، اُس دور میں عام طور پر کسی کو بھی باغی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنھما سے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا گیا اور ان کے پیروکاروں کے حق میں تو اُن سے بھی زیادہ شدید انداز میں مخالفت کی گئی، حتی کہ جب ابن جریج نے بصرہ میں قدم رکھا اور لوگوں نے انہیں وہاں کی جامع مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو وہاں پر موجود لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ اٹھا لئے اور اصحاب ابن عباس سے شاذ مسائل لینے کی وجہ سے ان کے حق میں بددعا کی، یہاں تک کہ ابن جریج کو وہاں ان لوگوں کے پاس سے ہٹنے سے پہلے بعض مسائل میں رجوع تک کرنا پڑا۔ چونکہ اس وقت لوگوں کے اندر دین اور تقوی غالب تھا اس لئے اس طرح کا واقعہ پیش آیا۔ دیکھا جائے تو اس زمانے میں لوگوں کا یہی احتیاط کسی کو بھی بغیر علم کے کوئی بات کہنے سے باز رکھتا تھا۔ یونہی اگر کوئی آدمی کسی معاملے کا اہل نہ ہوتا تو وہ اس معاملے میں اظہار خیال سے ڈرتا تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ لوگوں کے درمیان دین گھٹتا گیا، پرہیزگاری عنقا ہوتی گئی اور بغیر علم و اہلیت کے دینی معاملات میں اظہار رائے کا چلن عام ہو گیا۔ یقین جانئے! اگر ابتدائی زمانے کی روش پر آج کے متأخر زمانے میں بھی انفرادی صواب دید کے مطابق فتوی جاری کرنے کا سلسلہ چلتا رہتا تو اب تک دین کا نظام مجروح ہو کر رہ جاتا، حلال چیزیں حرام بن جاتیں اور حرام کو حلال قرار دے دیا جاتا۔ ہر شخص جو چاہتا، جیسا چاہتا من مانی کرتا اور پھر ہمارا دین متین بھی یقینی طور پر امم سابقہ کے ادیان کی طرح مخدوش ہو کر رہ جاتا؛ لیکن مشیت الٰہی کو ایسا منظور نہ تھا، اس لئے یہ صورت حال پیش ہونے سے پہلے ہی اس نے دین کے تحفظ اور سالمیت کا ایک راستہ بنا دیا یعنی اس نے امت مسلمہ کے بہبود و یکجہتی کے لئے ایسے ثاقب الرائے اور اہل السنۃ آئمہ (آئمہ اربعہ) پیدا کئے جنھوں نے اپنے علم، ادراک، درایت، بالغ نظری اور فقہ و فتاوی کے ذریعے احکام شرعیہ کو منظّم و مرتب کیا؛ سو اب ساری امت فتاوی میں ان کی عیال اور احکام شرعیہ کی معرفت کیلئے ان ہی کی طرف رواں دواں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی حکمت بالغہ سے ان آئمہ کو وہ علمی گہرائی اور فکری وسعت عطا کی تھی کہ انہوں نے خلق خدا کی شرعی رہنمائی کے لئے اپنی فکر خداداد سے مذاہب مختلفہ کی بنا ڈالی اور اُن کے لئے قواعد و ضوابط تحریر کئے، یہاں تک کہ مخصوص اصول و قوانین اور قواعد و ضوابط کے ساتھ ہر امام کا ایک علیحدہ مذہب معرض وجود میں آ گیا۔ چنانچہ اب انہی متعین اصولوں کی روشنی میں شرعی احکامات جاری ہوتے ہیں اور مسائل میں حلال و حرام کی تمیز کی جاتی ہے۔ بے شک! یہ مومنین پر اللہ کریم کا لطف عمیم ہے اور تحفظ

دین کے سلسلے میں اس کے جملہ وعدوں میں سے ایک وعدے کی خوبصورت تکمیل ہے۔

بغور جائزہ لیجئے تو پتہ چلے گا کہ اگر دین اور دینی احکام کے تحفظ کا یہ الٰہی نظام قائم نہ ہوتا تو ہمیں دین کے معاملے میں حیرت انگیز افراد نظر آتے، ہر سرگرداں احمق اپنی احمقانہ جسارت اور فکری بے راہ روی کے ذریعے لوگوں کو حیران و پریشان کر دیتا، چنانچہ کوئی یہ دعوی کرتا کہ وہ امام الآئمہ ہے، کوئی یہ دعوی کرتا کہ وہ امت کا ہادی ہے اور کوئی یہ دعوی کرتا کہ دینی معاملات میں خلق کا مرجع اور ارباب فکر و دانش کا عیال دار بس وہی ہے مگر بے پناہ شکر و احسان ہے اللہ کریم کا کہ اس نے ان تمام خطرات اور فسادات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ اپنے بندوں پر اللہ کریم کا بے پایاں کرم، بے گماں بخشش اور بیکراں رحمت ہے؛ تاہم اس کے بعد بھی گاہے بگاہے کچھ ایسے لوگ ضرور منظر عام پر آتے رہیں گے جن کا یہ دعوی ہوگا کہ وہ ''درجہ اجتہاد'' پر فائز ہیں اور وہ آئمہ اربعہ میں سے کسی کی بھی تقلید یا اطاعت کے بغیر علمی معاملات میں گفتگو کریں گے۔ اب ان میں کچھ افراد ایسے ضرور ہوں گے جن کا دعوی اجتہاد صحیح ہوگا اور ان کی باتیں دلوں کیلئے راحت کا ساماں فراہم کرینگی لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کا دعوی یکسر جھوٹا ہوگا اور ان کی باتیں کلیۃً قابل تردید ہونگی۔ اس خصوص میں اگر عوام مسلمین کی بات کریں تو چونکہ وہ اس درجہ اجتہاد تک نہیں پہنچے ہوتے اس لئے ان کیلئے آئمہ اربعہ کی تقلید کرنے اور ان کے تعین کردہ خطوط پر چلنے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے۔

اب اگر کوئی سرگرداں احمق یہ اعتراض کرے کہ اتنی بڑی امت بھلا چند گنے چنے علما کے اقوال پر کیسے انحصار کر سکتی ہے؟ یا انہیں بذات خود اجتہاد سے یا آئمہ اربعہ کے علاوہ دیگر علماء کی تقلید سے کیونکر روکا جا سکتا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح عہد رسالت کے بعد جب صحابہ کرام نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ امت مختلف حروف کے ساتھ قرآن پڑھتی رہی تو وہ بہت جلد کسی بڑے خطرے سے دوچار ہو جائے گی، اس لئے تقاضائے مصلحت کے تحت اجلہ صحابہ نے پوری امت مسلمہ کے درمیان ایک ''متعین حرف'' کو چھوڑ کر باقی تمام حروف کو متروک قرار دے دیا، بعینہ یہی صورت حال احکام شرع اور حلال و حرام کے فتاوی کی بھی ہے۔ بلاشبہ اگر آئمہ اربعہ کے تعین کردہ خطوط کے مطابق احکام شرع مرتب نہ کئے جاتے تو یہ امت فساد دین میں مبتلا ہو جاتی اور ہر جاہ پسند بیہودہ احمق خود کو زمرۂ مجتہدین میں شمار کرتا اور دین میں نئی نئی باتیں گڑھ کر انہیں اسلاف متقدمین کی طرف منسوب کر دیتا۔ چنانچہ بسا اوقات اسلاف کے اقوال میں تحریف کرتا جیسا کہ بعض ظواہر نے کیا بھی ہے، اور بسا اوقات اسلاف کی بعض لسانی

تسامحات جن کو ترک کرنے پر امت کا اجماع قائم ہو چکا ہے، کو بنیاد بنا کر اپنے موقف کی تائید کیلئے دلیلیں پیش کرتا۔اس لئے حکمت کا تقاضا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مشیت ایزدی کے مطابق تمام لوگ آئمہ اربعہ کے مذاہب پر جمع ہو جائیں۔

پھر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ قرآن کے ''احرف سبعہ'' میں سے ایک ''حرف'' کو اختیار کرنے اور آئمہ اربعہ کے اقوال پر لوگوں کے جمع ہونے کے درمیان بڑا فرق ہے، کیونکہ تحقیق کے مطابق قرآن کے حروف گرچہ سات تھے لیکن ان ساتوں حروف (لغات) سے حاصل ہونے والا معنی یا تو متحد تھا یا پھر متقارب تھا۔ برخلاف اقوالِ فقہائے اربعہ کے، کیونکہ یہاں ممکن ہے کہ یہ چاروں آئمہ کسی ''بات'' پر اتفاق کرلیں لیکن وہ ''بات'' درحقیقت حق کے ماسوا ہو۔اس لئے ''**جمع الناس علی مذاهب الأئمة الاربعة** ''کو ''**حرف واحد من الحروف السبعة من أحرف القرآن**'' پر بہر حال قیاس نہیں کیا جاسکتا؟؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو علماء نے ایسا گمان رکھنے سے منع کیا ہے، اور اس بات کی صراحت کی ہے کہ بے شک اللہ تعالی اس امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا۔اس کی تصدیق میں بہت سی حدیثیں [1] پیش کی جاسکتی ہیں۔

1۔ترمذی میں ہے: **عن ابن عمران رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان الله لايجمع امتى اوقال امة محمد على ضلالة ويد الله على الجماعة ومن شذ شذ الى النار** ۔(سنن ترمذی، ابواب الفتن، باب فی لزوم الجماعۃ)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالی میری امت کو، یا فرمایا: امت محمد کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا اور اللہ تعالی کا دست قدرت (تحفظ امت کے لئے) جماعت (اہل السنۃ) پر ہے، اور جو جماعت سے جدا ہوا وہ جہنم کی طرف جدا ہوا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا: **ان امتى لاتجتمع على ضلالة فاذا رأيتم اختلافا فعليكم بالسواد الاعظم** ۔(سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب السواد الاعظم)

ترجمہ: بے شک میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، سو جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کے ساتھ ہو جاؤ۔

دوسری بات یہ کہ اگر تھوڑی دیر کیلئے آپ کے اس مفروضہ کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ''یہ چاروں ہی آئمہ حق کے ماسوا کسی بات پر اتفاق کرلیں'' تو ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوگا تو شاذ ونادر ہی ہوگا اور کسی ایسی امکانی خطا پر صرف اور صرف کوئی ایسا مجتہد ہی مطلع ہوسکتا ہے جس کی نظر تحقیق کی اتنی گہرائی تک پہنچ چکی ہو جہاں تک ان آئمہ اربعہ کی رسائی نہ ہو پائی ہو، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا مجتہد نادر ونایاب ہے۔ باوجود اس کے، اگر تھوڑی دیر کیلئے کسی ایسے اعلیٰ وارفع مجتہد کے وجود کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو ایسی صورت میں اُن کے سامنے جو حق ظاہر ہوا ہوگا، اُس کی اتباع ان پر فرض ہے؛ اور دیگر لوگ چونکہ درجہ اجتہاد یا اجتہاد کی ایسی ارفع ترین منزل تک نہیں پہنچے ہوتے اس لئے ان پر تقلید ہی فرض ہوگی اور اس ضمن میں آئمہ اربعہ کی تقلید تو بلاشبہ ایک خوشگوار بات ہے۔ اگر بالفرض اس میں کوئی خطا بھی ہے تو خطا کا ''گناہ''[1] آئمہ پر ہے نہ کہ مقلدین یا دوسرے افراد پر۔

صحیح بخاری میں اسی خصوص میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث ہے، حدیث تو ذرا طویل ہے تاہم اس کا یہ جز خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **تَلزَم جماعةَ المسلمين و امامَهم** ۔ (صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب کیف الامر اذا لم تکن جماعۃ) مطلب یہ کہ جب زمانہ میں فتنہ پردازیوں کا چلن عام ہوجائے اور ضلالت کی آندھی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو تم اس وقت مسلمانون کی اکثریت اور ان کے امام کے ساتھ رہنا۔ اسی میں تمہارے لئے خیر وعافیت ہے۔

1۔ یہاں پر ''خطا من الأئمۃ'' کے تعلق سے فاضل مصنف حضرت علامہ حافظ ابن رجب حنبلی (۷۹۵ھ) کی عبارت ہے: **الاثم عليهم لا على من قلدهم** ۔ یعنی اگر قرآن وسنت سے مسائل کے استنباط واستخراج کے سلسلے میں کہیں خطا در آئے تو اس کا ''**اثم**'' آئمہ پر ہے، نہ کہ مقلدین پر۔ یہاں عبارت میں مستعمل یہ لفظ ''**اثم**'' تین حروف ''أ، ث، م'' کی ایک مجموعی وترتیبی شکل ہے اور ان تین حروف کی ترتیبی شکل سے معتبر لغات ومعاجم میں ہمیں جتنے بھی معانی ملتے ہیں، تقریباً اُن سبھی معانی کے اندر قباحت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ تو اب اس تشریحی تناظر میں مذکورہ بالا عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ اگر استنباط مسائل کے سلسلے میں آئمہ اربعہ سے ممکنہ طور پر کوئی خطا واقع ہوجائے تو اس خطا کی قباحت کا اثر خود آئمہ پر مرتب ہوگا، نہ کہ ان کی تقلید کرنے والے پر۔

اب انتہائی ادب واحترام کے ساتھ عرض ہے کہ آئمہ مجتہدین کے تئیں پیدا شدہ یہ مفہوم محل نظر ہے، کیونکہ علماء کی تصریحات کے مطابق اگر استنباط مسائل کے سلسلے میں مجتہد سے کوئی خطا واقع ہوجائے تو اسے اصطلاح میں ''خطائے

اگر معترض یہ اعتراض کرے کہ: تو اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس خطا پر آئمہ کی اتباع کی جائے جو حق کے ماسوا کہی گئی ہے اور جس کی وجہ سے مخالفین میں سے کسی ایک کا مذموم ہونا ضروری ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس امت کیلئے کبھی بھی خطا پر اتفاق نہیں ہوسکتا، اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر آئمہ اربعہ سے خطا واقع ہوئی بھی ہو تو وہ انتہائی شاذ ہے، اور دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ مسلمان ہر دم

اجتہادی'' کہتے ہیں، اور خطائے اجتہادی کی صورت میں باوجود وقوع خطا کے' اجتھاد فی طلب الصواب' کی وجہ سے مجتہد (وھو عالم بالا جتھاد) کو ایک اجر ملتا ہے احادیث مبارکہ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہے: **عن عمرو بن العاص انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران واذاحكم فاجتهد ثم اخطأ فله اجر** ۔(صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب: اجرالحاکم اذا اجتھد فاصاب اوأخطا)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا: جب کوئی حاکم کسی بات کا فیصلہ کرے اور اس میں اجتہاد سے کام لے اور یہ اجتہاد صحیح ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ اور پھر (کبھی ایسا ہو کہ) حکم دے اور اسی اجتہاد سے کام لے اور (اس بار اس کا اجتہاد) غلط ہو جائے تو اس کیلئے ایک اجر ہے۔

سنن دارمی میں ایک حدیث ہے، راوی واثلہ بن اسقع ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من طلب العلم فادركه كان له كفلان من الاجر فان لم يدركه كان له كفل من الاجر** ۔(سنن دارمی، باب فی فضل العلم والعالم، حدیث نمبر: ۳۴۷)

ترجمہ: جس کسی نے علم کو طلب کیا اور اسے ٹھیک ٹھیک پالیا تو اس کے لئے اجر کے دو حصے ہیں اور جس نے طلب تو کیا لیکن صحت نہ پائی تو اس کے لئے اجر کا ایک حصہ ہے۔

مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے تو یہ منشا متبادر ہوتا ہے کہ اگر ذی علم مجتہد سے اس کے اجتہاد میں کہیں کوئی خطا بھی در آئے تب بھی ''نفس اجتہاد'' کی وجہ سے وہ عند اللہ ماجور ہی ہوگا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جب خطائے اجتہادی کی صورت میں مجتہد کیلئے آقائے کائنات کی رحمت کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اجتھاد فی طلب الصواب کی وجہ سے بہر حال اجر ہی کا مستحق ہے تو پھر یہاں ''اثم'' کی بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے؟

مسائل شرعیہ کے محتاج ہوتے ہیں، اس لئے وہ آئمہ اربعہ کہ دینی احکامات کے سلسلے میں جن کی اقتدا کی جارہی ہے، اُن کے حق میں یہ اعتقاد رکھنا کہ انہوں نے خطا پر اجماع کیا ہے؛ قطعا جائز نہیں ہے۔ بیشک یہ بات اس امت کے حق میں ایک ایسا عیب ہے جس سے اللہ پاک نے اس امت کو پاک رکھا ہے۔

پھر اگر ہمارا معترض یہ اعتراض کرے کہ چلئے، ہم مان لیتے ہیں کہ عوام مسلمین بذات خود اجتہاد کے راستے پر نہیں چل سکتے، کیونکہ اس سے وہ ہلاکت کے دہانے تک پہنچ جائیں گے؛ لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ آئمہ اربعہ کے علاوہ دیگر آئمہ مجتہدین میں سے کسی بھی امام کی اتباع یا تقلید جائز نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آئمہ اربعہ کے ماسوا دیگر آئمہ مجتہدین میں سے کسی بھی امام کی تقلید جائز نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ آئمہ اربعہ کیسوا کسی بھی امام مجتہد کا مذہب نہ تو مشہور ہوا اور نہ ہی مرتب۔ اس لئے ان کی طرف بسا اوقات ایسی باتیں بھی منسوب کی گئیں جو انہوں نے یا تو سرے سے کہی ہی نہ تھیں یا کہی تھیں تو وہ مفہوم مراد نہ تھا۔ پھر ان مذاہب کا کوئی ایسا حامی بھی نہیں جو بوقت ضرورت ان کی حمایت وتائید کرے اور ان میں واقع شدہ خلل کو دور کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس کے برخلاف جو مشہور مذاہب ہیں یعنی آئمہ اربعہ کے مذاہب؛ ان کے بے شمار حمایتی ہیں جو بوقت ضرورت ان مذاہب میں درآمد شدہ خلل کو دور کرتے رہتے ہیں۔

پھر اگر جناب معترض یہ اعتراض لے کر رونق محفل بن جائے کہ: محترم! آئمہ اربعہ کے علاوہ کسی دوسرے امام مجتہد کے ایسے مذہب کی تقلید کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو مذاہب اربعہ مشہورہ ہی کی طرح مدون، مرتب اور محفوظ ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اب تک کسی ایسے مذہب کے وجود ہی کا علم نہیں ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسے مذہب کے وقوع، اس کے متبعین کے جواز اور مذہب کی طرف ان کے انتساب کو مان بھی لیا جائے تو کسی ایسے مفروضہ مذہب کی تقلید صرف اور صرف کسی ایسے ہی شخص کیلئے جائز ہوگی جو علانیہ اس مذہب کی طرف اپنی نسبت کو ظاہر کرے، اس مذہب کے اقوال کی روشنی میں فتاوی جاری کرے اور اس مذہب کی حمایت وتائید میں ہر دم سرگرم رہے۔ چنانچہ کوئی ایسا شخص جس نے علانیہ آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی طرف اپنی نسبت ظاہر کی اور باطنی طور پر آئمہ اربعہ کے علاوہ کسی دوسرے کے مذہب کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا تو یہ بات یقینی طور پر ناروا بلکہ ایک طرح کا نفاق اور تقیہ

ہوگی، خصوصیت کے ساتھ کوئی ایسا شخص جس نے آئمہ اربعہ میں سے کسی کے مقلدین سے محض اوقاف وغیرہ کے مال حاصل کرنے کے لئے اس امام مشہور کی جانب اپنی نسبت ظاہر کردی، (تو وہ پکا منافق اور تقیہ باز ہوگا)۔ یونہی کسی نے لوگوں پر تلبیس کی ہو (یعنی دیگر لوگوں کو دھوکے میں رکھ کر اپنے کو ان سے چھپایا ہوا ہو)، بایں طور کہ خود کو کسی امام مشہور کا مقلد بتا کر اپنے پوشیدہ امام کے مذہب کے مطابق لوگوں کے درمیان یہ کہہ کر فتوی جاری کرتا ہو کہ یہ مثلاً فلاں امام مشہور کا مذہب ہے، تو یہ بات اور اس طرح کی تقلید قطعی طور پر ناروا، امت پر تلبیس اور علمائے امت پر افترا ہے۔ یونہی کسی شخص نے آئمہ اسلام کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت کی جو انہوں نے کہی ہی نہ تھیں یا اس کے خلاف کہی تھیں تو وہ شخص ضرور جھوٹا اور عذاب الٰہی کا مستحق ہے۔ یونہی کسی شخص نے آئمہ اربعہ میں سے کسی متعین امام کے مذہب پر کوئی کتاب لکھی اور اس میں اپنے پوشیدہ امام کے مذہب کو بغیر حوالے کے شامل کر دیا؛ یونہی لکھی گئی کتاب تو کسی متعین مذہب سے متعلق نہ تھی لیکن کتاب کا مصنف ظاہری طور پر آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کا مقلد تھا لیکن پوشیدہ طور پر کسی اور کا، سو اس نے اپنی کتاب میں اپنے پوشیدہ مذہب کی باتیں اس کے ظاہری مذہب کے ساتھ اختلاف ظاہر کئے بغیر ہی لکھ دیں؛ تو یہ تمام کی تمام صورتیں ایہام اور تدلیس کی ہیں جو بہرصورت ناجائز ہیں۔ اس کا بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ایسی باتوں سے مذاہب کے درمیان خلط اور اضطراب پیدا ہو جائے گا۔ تو اگر کوئی ایسا شخص اجتہاد کا دعوی کرتا ہے تو وہ نہایت ہی ضدی، فسادی اور سرکش ہے اور اس کا یہ دعوی اجتہاد انتہائی بیہودہ ہے۔

ہاں! کوئی ایسا شخص جس کے اندر اجتہاد کے تمام شرائط موجود ہوں، مثال کے طور پر اجماع اور اختلاف کی معرفت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر اجتہاد کے بقیہ تمام شرائط معروفہ پائے جاتے ہوں، سنت کے تئیں کثیر الاطلاع ہو، صحیح و سقیم حدیثوں کے درمیان تمیز کی قوت کیساتھ ساتھ صحابہ و تابعین کے مذاہب اور ان سے منقول آثار سے گہری واقفیت رکھتا ہو تو ایسے شخص کا دعوی اجتہاد البتہ قابل قبول ہوگا۔ اسی لئے امام احمد بن حنبل فتاوی کے معاملے میں بہت ہی زیادہ سختی برتتے اور وہ افراد جنہیں ایک لاکھ ایک ہزار یا اس سے بھی زیادہ حدیثیں یاد ہوتیں، انہیں بھی کار افتا سے منع فرماتے تھے۔

کسی شخص کے دعوی اجتہاد میں سچے ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ آئمہ اربعہ کی طرح اپنے کلام میں مستقل ہو، اور اس کا کلام دوسرے کے کلام سے ماخوذ نہ ہو۔ چنانچہ کوئی ایسا شخص جس نے محض اغیار کے کلام کو بطور **حُکم، حَکم یا دلیل** کے نقل پر اکتفا کرنا شروع کر دیا تو یہاں اس کی غایت جدوجہد صرف یہ ہوگی کہ وہ کلام کے مفہوم کو سمجھ جائے، اور بسا اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ مفہوم کلام ہی کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ پاتا، چہ جائیکہ اس کے حق میں درجہ اجتہاد پر فائز

ہونے کا تصور کیا جائے؟ کیا ہی خوب کہا ہے کسی نے۔۔۔ع:

فدع عنک الکتابة لست منها۔۔۔ولو سودت وجهک بالمداد

فن کتابت میں طبع آزمائی سے باز آجا، کیونکہ تو گرچہ اپنے چہرے کو روشنائی سے سیاہ کرلے پھر بھی یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے۔

اب اگر حضرت معترض یہ اعتراض لیکر کھڑا ہو جائے کہ چلئے جناب! سب مان لیا، لیکن یہ بتائیے کہ امام احمد اور ان کے علاوہ دیگر آئمہ نے تو ان کی تقلید اور ان کے کلام کی کتابت سے سختی کے ساتھ منع فرمایا تھا؛ چنانچہ اس حوالے سے امام احمد اکثر کہا کرتے تھے کہ ''نہ تو میرے کلام کو لکھو اور نہ ہی فلاں فلاں کے کلام کو لکھو اور علم اسی طرح حاصل کرو جس طرح ہم نے حاصل کیا ہے''۔ دیکھا جائے تو اس قسم کی باتیں آئمہ کے کلام میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں لیکن آپ حضرات ان کے کلام کو لکھتے بھی ہیں اور ان کی تقلید بھی کرتے ہیں، تو اس بارے میں پھر کیا کہنا ہے آپ لوگوں کا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لاریب امام احمد نے محض آراء فقہاء میں مشغول ہونے، انہیں یاد کرنے، لکھنے اور ان کے درس و تدریس سے منع فرمایا تھا بلکہ اس کی جگہ آثار صحابہ و آثار تابعین کے ادراک، ان کے سوا دوسروں سے استغنا، آثار میں صحت وسقم کی معرفت، مآخذ کی شناخت اور قول شاذ وغیرہ کو پہچاننے کی تاکید کی تھی؛ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وہ باتیں ہیں جن کا اہتمام پہلے امام خود کرتے، پھر دوسروں سے کہتے۔ چنانچہ جنہیں ان باتوں کی معرفت حاصل ہوگئی اور وہ اپنی معرفت کی انتہا تک پہنچ گئے جس کی طرف امام احمد نے اشارہ کیا ہے، تو وہ گویا علمی لیاقت میں امام احمد کے قریبی درجے تک پہنچ گئے؛ لہذا ان پر اب نہ تو کسی قسم کی رکاوٹ ہے اور نہ ہی یہ گفتگو ان کے سلسلے میں ہے بلکہ امام احمد کی مذکورہ ممانعت تو اس بندے کے حق میں ہے جو نہ تو علم کی اس حد تک پہنچا، نہ سمجھا اور نہ ہی اسے اس اعلی ترین منزل کی آشنائی حاصل ہوئی، جیسا کہ موجودہ زمانہ بلکہ زمانہ دراز ہی سے اکثر لوگوں کا حال رہا ہے۔ انہیں اس بات کا دعوی تو ہے کہ وہ علم کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ابھی اپنے علمی سفر کا آغاز بھی نہیں کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس بات کی حقیقت کا ادراک کرنا چاہیں تو کتاب وسنت کو بنیاد بنا کر امام احمد کی علمی گہرائی پر ایک نظر ڈال لیں۔

اگر کتاب وسنت کے حوالے سے امام احمد بن حنبل کی علمی گہرائی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ امام احمد مطالعہ قرآن، تفہیم قرآن اور علوم قرآن میں اپنی مثال آپ تھے؛ چنانچہ اپنے حلقہ احباب

میں امام اکثر کہا کرتے تھے کہ اب لوگوں نے قرآن کو سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ امت کی اصلاح کے لئے قرآن کے موضوع پر انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں؛ مثال کے طور پر کتاب الناسخ والمنسوخ، المقدم والمؤخر اور جمع تفسیر کبیر۔ آخر الذکر نگارش صحابہ وتابعین کے کلام پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امام احمد اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

دیکھا جائے تو وہ امتیازی باتیں جو امام احمد کو ان کے ہم عصر علماء کے درمیان ایک انفرادی شناخت عطا کرتی ہیں ،ان میں سے ایک ان کی وسعت وکثرت حفظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں تین لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ ان کی نمایاں خصوصیات میں احادیث کے اندر صحت وسقم کی پہچان اور ثقہ ومجروح راویوں کی شناخت بھی ہے بلکہ اس خصوص میں تو وہ تحقیق کی آخری چوٹی پر تھے۔ اگرچہ علل احادیث مرفوعہ کی شناخت میں دیگر کثیر حفاظ بھی ان ساتھ شریک نظر آتے ہیں تاہم آثار موقوفہ کی علتوں کی معرفت کے حوالے سے کوئی بھی ان کے پایہ کو نہیں سکا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ جس نے بھی ان کے کلام میں غور وفکر کیا، وہ حیرت زدہ رہ گیا اور آخر کار اسے یقین کرنا پڑا کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس فن میں امام احمد کے ہم پلہ ہیں۔

امام احمد کی امتیازی خصوصیات میں فقہ حدیث کی معرفت، اس کی تفہیم، اس کے حلال وحرام اور اسباب کا ادراک بھی ہے۔ ان کے ہم عصر علماء ابوعبید اور امام اسحٰق وغیرہ کی شہادت کے مطابق اس فن میں وہ اپنے زمانے کے سب سے ممتاز فرد تھے؛ چنانچہ جس شخص نے بھی فقہ میں ان کے کلام اور کلام کے مآخذ ومراجع پر غور کیا، اُسے ان کی قوت استنباط اور قوت ادراک کا خوب خوب اندازہ ہو گیا۔

لگے ہاتھوں یہاں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلاتے چلیں کہ بسا اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ فقہ کے کسی مسئلہ میں ان کے کلام کی انتہائی باریکی کی وجہ سے ان ہی کی تقلید کرنے والے بہت سے اہل تصانیف آئمہ پر اس کا سمجھنا دشوار ہوا تو انہوں نے امام کے دقیق مآخذ کو چھوڑ کر ضعیف مراجع کو اپناتے ہوئے اسے دیگر مذاہب والوں کے ساتھ ملا لیا؛ نتیجے میں غیر محل پر اُن کے کلام کو محمول کر لئے جانے کی وجہ سے ان کے اصل مدعا کو سمجھنے میں بہت زیادہ رکاوٹیں پیش آئیں، اس لئے ان کے کلام کو صحیح خطوط پر سمجھنے کے لئے ایک حنبلی مقلد کے اندر بہت زیادہ گہرائی و وسعت کی ضرورت ہے۔

امام احمد بن حنبل کے علم وادراک کے حوالے سے تو ایسی ایسی روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اور بھلا ایسا کیوں نہ ہو؟ جبکہ صحابہ، تابعین یا تبع تابعین کے درمیان کوئی ایسا نزاعی یا کلامی مسئلہ نہ ہوگا جس کا انہیں علم نہ

رہا ہو۔ امام نے ان تمام مسائل کا احاطہ کیا، انہیں جانا، ان کے مآخذ کو سمجھا اور امت کو ان تمام مسائل کی ماہیت بھی سمجھائی۔ یونہی بلاد اسلامی کے آئمہ وفقہاء؛ مثال کے طور پر امام مالک، امام اوزاعی اور امام ثوری وغیرہ کے نکتہائے نظر کا بھی خوب خوب ادراک واحاطہ کیا۔ سو جب امام احمد کے سامنے ان آئمہ کے فتاوی پیش کئے گئے تو انہوں نے ان کا مدلل جواب دیا۔

کچھ لوگوں نے ان کے سامنے مؤطا وغیرہ سے امام مالک کے مسائل اور فتوے پیش کئے تو ان کا بھی کافی ووافی جواب دیا اور حنبل وغیرہ نے اسے نقل بھی کیا، اسحٰق بن منصور نے ان کے سامنے ثوری کے عام مسائل پیش کئے تو انہوں نے ان کا بھی تحقیقی جواب دیا۔ واضح رہے کہ امام احمد بن حنبل ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصحاب امام ابوحنیفہ کی کتابوں کو لکھا، انہیں باریکی سے سمجھا اور فقہ میں ان کے مآخذ کی تحقیق کی۔ امام احمد نے امام شافعی کی زیارت کا بھی شرف حاصل کیا، ایک مدت تک ان کی صحبت اختیار کی اور علم حاصل کیا۔ امام احمد کے تعلق سے امام شافعی کی وہ عظیم شہادات اسی دور طالب علمی کی ہیں جب امام احمد بالکل نوجوان تھے اور ابھی نکاح بھی نہ کیا تھا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس نے بھی ان تمام علوم کو سمجھ لیا اور ان میں مہارت حاصل کر لی تو اس کیلئے مدون اصولوں اور معروف مآخذ پر قیاس کرتے ہوئے نو پید حالات کا ادراک اور ان کا شرعی حل چنداں دشوار نہ ہوگا۔ چنانچہ اسی بات کی ترجمانی کرتے ہوئے ابوثور نے امام احمد کے حوالے سے بیان کیا کہ ''جب کبھی ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو یوں لگتا جیسے کائنات کا سارا علم ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان سمایا ہوا ہے''۔۔۔ابوثور نے یہی کہا یا ایسا ہی کچھ کہا۔۔۔اور ہمیں نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث ایسی بھی تھی جو امام احمد کو یاد نہ رہی ہو۔ شواہد کے مطابق امام احمد حدیث پر، جبکہ وہ حدیث صحیح ہو اور اس کے مقابل کوئی قوی معارض نہ ہو، اور لوگوں سے زیادہ سختی کے ساتھ عمل کرتے تھے۔ مگر ہاں! کوئی ایسی حدیث جو شرائط آئمہ کے مطابق درجہ صحت کو نہ پہنچتی ہو یا اس کے مقابل کوئی قوی معارض ہو تو امام صاحب اسے لینے میں البتہ احتراز کرتے تھے۔

یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلاف کرام زمانہ نبوت سے قریب ہونے اور صحابہ، تابعین وتبع تابعین کے کلام کے ساتھ کثرت مشق وممارست کی وجہ سے ان شاذ احادیث کو جن پر عمل متروک ہے یا قائم ہے، اوروں سے زیادہ پہچانتے تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس خصوص میں اسلاف کو ایسی باتوں کی بھی شناخت تھی جو بعد والوں کو نصیب نہ ہوئیں کیونکہ بعد والوں تک درازی عرصہ کی بنیاد پر جو سنتیں پہنچیں، وہ خود راویوں کے ذریعے نہیں بلکہ کتابوں

کے ذریعے پہنچیں۔

اے مذہب حنبلی کے مقلد! جب تم نے اس بات کو سمجھ لیا اور جان لیا تو اب میں تمہیں خالصًا لوجہ اللہ تعالی چند باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ فرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **لایؤمن احدکم حتی یحب لأخیه مایحب لنفسه**۔[1] یعنی: تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مومن بھائی کیلئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے تو خوب غور سے سنو! ہرگز ہرگز اپنے دل میں یہ خیال نہ کرنا کہ تمہاری نظر تحقیق کی اس گہرائی تک پہنچ گئی ہے جہاں تمہارے امام کی نظر نہیں پہنچ سکی، اور یہ کہ تم ادراکات کی اس منزل پر فائز ہو چکے ہو جہاں ارباب علم کے درمیان چمکتا ہوا فضل وکمال کا وہ ستارہ بھی فائز المرام نہ ہوسکا۔ یاد رہے کہ تمہارے امام نے قرآن وسنت کے جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے، ایک مقلد کی حیثیت سے تمہاری پوری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ تم ماقبل میں گزری ہوئی تشریحات کے مطابق انہیں سمجھنے کی کوشش کرو، پھر تمام ''مسائل علم'' میں اپنے امام کے موقف پر خوب غور کرو، البتہ ''مسائل اسلام'' اس قاعدے سے مستثنی ہیں۔

واضح ہو کہ ''مسائل اسلام'' سے مراد ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل اور ایمان بالیوم الآخر ہے جبکہ ''مسائل اسلام'' سے مراد وہی علم ہے جسے اکثر علما اصطلاح میں ''علم بالسنۃ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام احمد علم بالسنۃ میں بے نظیر و بے مثیل تھے اور اس علم کے مسائل کی حفاظت کے سلسلے میں انہیں انتہائی روح فرسا حالات سے بھی گزرنا پڑا تاہم انہوں نے ان تمام آزمائش وابتلاء پر خالصًا لوجہ اللہ صبر کیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنی بھی باتیں اس امام نے کہیں، تمام مسلمانوں نے انہیں حرز جاں بنایا اور جو مقام انہوں نے حاصل کیا، سب نے اسے تسلیم بھی کیا اور اس بات کی گواہی بھی دی کہ بے شک وہ ''امام السنۃ'' ہیں۔ گر وہ نہ ہوتے تو بہت سے لوگ کافر ہو جاتے۔

سوچنے والی بات ہے کہ ''علم السنۃ'' میں جس امام کا مقام اتنا اعلی و بالا ہو، وہ اسی علم کے سلسلے میں کسی دوسرے عالم کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے؟ خصوصیت کے ساتھ اس شخص کے تئیں جس نے اس کی تقلید کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ لہذا اے پیارے! اس عظیم الشان امام کے مقلد ہونے کے ناطے تم پر لازم ہے کہ اس باب کے عام مسائل

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب: من الایمان ان یحب لاخیہ مایحب لنفسہ۔

میں اپنے موقف پر قائم رہو، اور غیر ضروری نو پید مسائل میں الجھنے سے احتراز کرو۔ دیکھا جائے تو مسلمانوں کو اس طرح کے مسائل میں الجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ غیر ضروری مسائل کے حق میں کی جانے والی بحث وجدال کے نتیجے میں پیدا شدہ باہمی تناؤ علم نافع کی راہ میں ایک بڑا آڑ بن جاتا ہے، مسلمانوں کے درمیان بغض وعداوت کی مسموم فضا استوار ہوتی ہے اور اس طرح یہ کرۂ ارضی جنگ وجدال کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبل اور دیگر آئمہ سلف نے اس بات کو انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

اگر علم تصوف جو مراقبہ اور خشیت الٰہی سے متعلق ایک مستقل علم ہے، کے حوالے سے بات کی جائے تو امام احمد علم بالاسلام ہی کی طرح علم تصوف کے بھی نقطہ عروج پر ایک روشن علامت نظر آتے ہیں، تاہم علم تصوف میں ان کا غالب رجحان تحقیق اعمال پر تھا نہ کہ تزئین احوال پر؛ اسی وجہ سے متأخرین نے خلف سے جو باتیں نقل کی ہیں وہ انہیں چھوڑ کر صرف ایسی ہی باتوں پر اکتفا کرتے جو سلف سے تواتر کے ساتھ نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ امام احمد جمیع علوم میں مستند بالسنۃ تھے، اس لئے وہ باتیں جو سلف صالحین نے نہیں کہی تھیں، وہ بھی نہیں کہتے تھے۔ بالخصوص علم الایمان اور علم تصوف میں تو وہ اسلاف کی یادگار تھے۔

اگر خصوصیت کے ساتھ علم الاسلام کی بات کریں تو اس سلسلے میں امام احمد نظریہ ضرورت کے تحت نو پید حالات و حوادث کا شرعی جواب تو ضرور دیتے تاہم اپنے اصحاب کو ایسے مسائل میں قیل وقال سے منع بھی فرماتے جن میں ان کا امام خاموش ہو۔ امام احمد عام طور پر ایسے مسائل کا جواب دیتے جو مسلم معاشرے میں ناگزیر، جن کا وقوع بہت ممکن اور جن کے احکام کی معرفت انتہائی ضروری ہو۔ جن کی تفصیلات ماقبل میں گزر گئیں۔ اب رہی بات فقہا کی جودت طبع کی بنا پر معرض وجود میں آنے والے وہ مسائل جو یا تو عدیم الوقوع ہیں یا پھر نادر الوقوع تو امام احمد ایسے مسائل سے بہت زیادہ بچنے کی کوشش کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے مسائل میں الجھنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہونے والا بلکہ امت کے سامنے ان سے کہیں زیادہ اہم مسائل درپیش ہیں جن کی معرفت اور حل بہت ضروری ہے۔ امام احمد علوم و معارف اور احوال وآثار میں زیادہ قیل وقال اور جنگ وجدال کو پسند نہیں کرتے؛ وہ اس سلسلے میں فقط سنت وآثار پر اکتفا کرتے اور لمبی لمبی بحثوں و بڑی بڑی باتوں سے اعراض کر کے فقط معنی حقیقی کی تفہیم پر زور دیتے، تاہم یہاں امام احمد کے اس محتاط رویہ سے ہرگز بھی یہ نہ خیال کیا جائے کہ امام نے اپنی لاعلمی یا کم علمی کی بنا پر ان معاملات میں گفتگو

کرنے سے اعراض کیا ہے ؛ نہیں جناب ! ایسا ہرگز بھی نہیں ہے ، بلکہ انہوں نے اپنے تقوی ، فضل وکمال ، سنت کے ساتھ تمسک اور خصوصا سلف صالحین یعنی صحابہ کرام وتابعین عظام کی اقتداء کی وجہ سے ان معاملات میں اظہار رائے سے بچنے کی کوشش کی ہے کیونکہ امام صاحب کو اس بات پر پورا یقین تھا کہ جو بھی شخص اسلاف کی روش پر چلے ، ہدایت یقینی طور پر اس کے ساتھ چلتی ہے۔

اے مقلد ! اگر تم اس نصیحت کو قبول کرتے ہو اور صحیح راستے پر چلنا چاہتے ہو تو تم پر لازم ہے کہ سب سے پہلے کتاب وسنت کے الفاظ کو یاد کرو ، پھر آئمہ دین اور اعاظم امت کے فرامین کی روشنی میں ان الفاظ وعبارات کے معانی کو سمجھو ، پھر صحابہ ، تابعین اور آئمہ بلاد اسلامی کے کلام وفتاوی کو حفظ کرو ، امام احمد کے کلام کو پہچانو ، ان کے بیان کردہ حروف کے ساتھ اسے ضبط کرو ، اس کے معانی کا ادراک کرو اور پھر اس کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرو۔ جب تم ادراک کے اس درجے تک پہنچ جاؤ تو اپنے دل میں ہرگز بھی یہ خیال نہ کر لینا کہ تم ادراکات کی انتہا تک پہنچ گئے ہو۔ بیشک تو اب بھی جملہ متعلمین میں سے ایک متعلم ہے۔ لہذا اگر تم نے زمانہ امام احمد میں موجود علوم ومعارف اور احوال و آثار کو جان لینے کے بعد اپنے دل میں یہ گمان کر لیا کہ تم ادراکات کی انتہا پر پہنچ گئے ہو یا تمہاری نظریں علوم ومعارف کی اتنی گہرائی تک پہنچ چکی ہیں جہاں کبھی اسلاف کی رسائی ہوا کرتی تھی ، تو افسوس ! تم نے کتنا برا خیال کیا ۔ ۔ ۔ ؟

یہ بھی کتنی افسوسناک بات ہے کہ مذکورہ علوم کو یاد کرنے اور نصوص وآثار کو ضبط کرنے کی بجائے تم باہمی جنگ و جدال اور کثرت قیل وقال کو ہوا دیتے رہو۔ بعض کے اقوال کو بعض دوسرے کے اقوال پر ترجیح دینے لگو ، دراں حالیکہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ قائلین میں سے کون معتبر تھا اور کون غیر معتبر ؟ سنو ! ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو اپنے آپ کو ان باتوں سے بچاؤ ، اور سنو ! قرآن وحدیث کے تعلق سے ہرگز کوئی ایسی بات نہ کہنا جو اسلاف نے نہ کہی ہو۔ تمہارے امام نے تمہیں اسی بات کی تاکید کی ہے ، اگر ایسا کرو گے تو علم نافع کی راہ مسدود ہو جائے گی اور تمہارے ایام برباد ہو جائیں گے ، کیونکہ علم نافع : وہ علم ہے جو سینوں میں محفوظ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واسلاف سے تواتر کے ساتھ نقل ہوتا چلا آئے۔ علم نافع یہ نہیں کہ ہر بات پہ کہو : أرأیت ؟ أرأیت ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صحابہ ، تابعین اور آئمہ مجتہدین نے ایسا کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ پھر ذرا سوچو تو سہی کہ انصاف کی کسوٹی پر تمہارا یہ دعوی تقلید کس طرح کھرا اتریگا جب تم عملی طور پر اپنے امام کی مخالفت پر مصر رہو اور ان کے علوم ، افعال اور بتائے ہوئے طریقے سے دور بھاگتے رہو ؟ اللہ کریم ہمیں توفیق رفیق سے نوازے ۔ ۔ ۔ یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھو کہ اگر تم نے صحیح معنوں میں اپنے

امام کے طریق کو اختیار کیا، اس راہ میں آبلہ فرسائی کی جو فی الواقع موصل الی اللہ ہے، اپنے دل میں خوف خدا بسائے رکھا اور آئمہ سلف کے احوال وآثار میں خیر اندیشی کے ساتھ غور وفکر کی تو یقینی طور پر اللہ تعالی تمہارے علم میں اضافہ فرمائے گا اور تمہاری نفسانیت بہت ہی حقیر اور پست ہوتی نظر آئے گی بلکہ تمہارے دل میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ تم خود بخود اختلاف بین المسلمین سے دور ہٹتے جاؤ گے۔

اے مقلد! سنو! تم جبری طور پر مومنین کی تمام جماعتوں کا حاکم نہ بن جانا، کہ گویا تمہیں وہ علم عطا کر دیا گیا ہے جو اوروں کو نہیں دیا گیا اور تم ادراکات کی اس بلندی پر پہنچ گئے ہو جہاں پر دوسرے علما نہیں پہنچ سکے۔ اللہ پاک ہر ایک کو علمی، عملی اور شخصی تناظر میں اساءت ظن سے محفوظ رکھے۔ یونہی اسلاف کے تعلق سے حسن ظن رکھیو، اپنے اندر کی خامیوں کو پہچانو اور اسلاف کے محاسن وکمالات پر غور کرو۔ خیال رہے کہ کوئی بھی شخص امام احمد جیسے آئمہ دین کے خلاف سرکشی پر آمادہ نہ رہے، خصوصیت کے ساتھ وہ جوان کا مقلد ہے۔

اگر تم نے ہماری نصیحتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مکابرہ ومجادلہ کی راہ پر چلنے کی عادت بنالی، یونہی علما کی تضحیک، خود پسندی اور بیہودہ گوئی جیسی ممنوعہ باتوں کا ارتکاب کرتے رہے، آئمہ دین کی توہین وتردید کو اپنا شعار بنالیا اور سلف کی عیب جوئی اپنی فطرت میں شامل کر لی تو یقین جانو! تم نے اپنے لئے محض غرور اور جاہ پسندی کو بڑھاوا دیا، حق سے دور ہوتے گئے اور باطل کی ہم نشینی اختیار کر لی۔

اس وقت اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں بھلا ایسی باتیں کیوں نہ کروں جبکہ میں اپنے فکر وفن کے اعتبار سے اوروں سے ممتاز ہوں؟ اور بھلا مجھ سے بڑا عالم اور فقیہ کون ہے؟ جیسا کہ (اس روش پر) حدیث بھی وارد ہے۔ اگر یہی خیال ہے تو اے مقلد! اچھی طرح سن لو! ایسی باتیں اس امت کا صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو جہنم کا ایندھن ہے۔ اللہ کریم ہمیں ایسی رسوائیوں سے بچائے اور اپنے فضل وکرم سے نصیحتوں کو قبول کرنے اور سلف صالحین کے طریق پر گامزن ہونے کی توفیق دے۔ بیشک وہ ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین ہے۔

اگر تمہیں اسی بات کا اصرار ہے کہ علم اور تفقہ اقوال کو نقل کرنے اور ان پر کثرت کے ساتھ بحث وجدال قائم کرنے کا نام ہے، یونہی جو شخص چرب زبانی کا جوہر دکھائے اور آئمہ دین کے اندر اپنی نظر واستدلال کے ذریعے خامیاں تلاش کر لے، وہ خاموش طبع آئمہ سے زیادہ اعلی وارفع ہے تو میں بطور جواب کہوں گا کہ ایسا ہرگز بھی نہیں ہے، کیوں کہ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو اہل ضلالت کے کچھ گروہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خلف اپنی کثرت قیل وقال کی وجہ سے سلف سے

زیادہ فضیلت والے ہیں تو ان کی یہ باتیں تو یقینی طور پر صحیح ہونی چاہئے تھیں؟ حالانکہ ہم سب متفقہ طور پر ایسے افکار و نظریات سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور پھر کیا خیال ہے معتزلہ و روافض کے شیوخ کے بارے میں؟ آپ کے پیش کردہ ضابطہ کے مطابق تو انہیں آئمہ دین اور اعیان امت کا سردار ہونا چاہئے، کیونکہ شیوخ معتزلہ مثلاً عبدالجبار بن احمد ہمدانی وغیرہ تو بحث و تکرار میں بے مثال تھے اور اُن کے تاب سخن میں بھی کوئی کلام نہیں۔ یونہی تمام جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اہل کلام حضرات بھی سخن سازی میں بےنظیر ہوا کرتے تھے۔ یونہی علم کلام کے مصنفین اور تمام جماعتوں کے فقہا، کہ ان حضرات نے کسی بھی مسئلے میں گفتگو کو اتنی زیادہ طوالت دی کہ خود ان کے آئمہ فن نے ان مسائل کی توضیح کے سلسلے میں اتنی زیادہ طوالت کا خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا؛ تو کیا اب مذکورہ افراد کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا روا ہوگا کہ یہ لوگ آئمہ اسلام مثلاً امام سعید بن مسیّب، امام حسن، امام عطا، امام نخعی، امام ثوری، امام لیث، امام اوزاعی، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام اسحٰق اور امام ابوعبید وغیرہم جیسے فکر وفن کے تاجداروں سے بھی ممتاز ہوگئے؟ تاریخ اسلام کا ذرا تعمق نظری کے ساتھ مطالعہ کرو تو یہ بات اچھی طرح عیاں ہو جائے گی کہ تابعین عظام بنیادی طور پر صحابہ کرام سے زیادہ سحر البیان اور وسیع اللسان تھے تو کیا کسی مسلمان کیلئے یہ عقیدہ رکھنا جائز ہوگا کہ تابعین عظام علم وفضل میں صحابہ کرام سے بھی آگے نکل گئے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: **الایمان یمان و الفقه یمان و الحکمة یمان**۔[1] پر بھی ذرا غور کرو! ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں اہل یمن کی مدح سرائی اور فضیلت کے تعلق سے کہیں، ان کیلئے فقہ اور ایمان کی شہادت دی اور واضح طور پر یہ بتا دیا کہ عنقریب اہل یمن ایمان، فقہ اور حکمت کی انتہا تک پہنچ جائیں گے لیکن ہمیں سلف سے لیکر خلف تک علمائے امت کے درمیان کسی بھی ایسے گروہ کے بارے میں نہیں معلوم جو اہل یمن سے زیادہ کم سخن اور کم جدال رہا ہو۔ تو کیا حضور شارع علیہ السلام کے اس فرمان سے صاف صاف یہ ظاہر نہیں ہوا کہ لائق ستائش علم اور فقہ وہ ہے جو اوامر و نواہی کی تعلیم کے ساتھ دلوں میں اللہ کی محبت، الفت، شان جلالت اور عظمت ربوبیت کا احساس جگائے، جو بلاشبہ قدیم علمائے یمن مثلاً ابوموسیٰ اشعری، ابومسلم خولانی اور اویس وغیرہم کا دستور حیات رہا ہے؟

بالا توضیحات سے یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ وہ لوگ ہرگز بھی لائق ستائش نہیں ہو سکتے جو بعض کے اقوال کو بعض کے ساتھ ملا کر دین میں نئی نئی باتیں پیدا کریں اور ہمیشہ آئمہ دین کے اندر لغزشوں اور خامیوں کی تلاش میں سرگرداں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تفاضل اھل الایمان فیہ ورجحان اھل الیمن فیہ۔

رہیں، حالانکہ اس سلسلے میں بات صرف اتنی تھی کہ اکثر آئمہ سے مسائل کے اجتہاد میں کہیں کہیں ایک آدھ خطا واقع ہوگئی ہے مگر اس سے ان کی امامت اور علمیت میں کیا فرق پڑ جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اتنی معمولی اجتہادی خطائیں تو اُن آئمہ کے غیر معمولی محاسن، راست خطوط پر بے شمار استنباط، حسین تر مقاصد اور وسیع ترین دینی خدمات کے اندر کہیں کھو کر رہ گئی ہیں۔ اس لئے ان کی لغزشوں کی افشا کے لئے یوں کمر کس لینا کوئی قابل تعریف اقدام نہیں ہے، خصوصیت کے ساتھ ایسے مسائل میں جن کے اندر وقوع خطا سے نہ تو عوام مسلمین کا کوئی نقصان ہے اور نہ ہی افشائے خطا سے کسی طرح کا کوئی فائدہ۔ لہذا ایسے فضول عناوین پر بحث ومباحثہ کی محفل آرائی ایک ناقابل فہم بات ہے؛ بلکہ دیکھا جائے تو اس طرح کی قیل وقال اور کثرت جدال سے خدا اور ذکر خدا سے دوری پیدا ہوتی ہے، دل یاد الٰہی سے غافل ہو جاتے ہیں اور خلق خدا کے درمیان انانیت اور جاہ پسندی کا مکروہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام تر باتیں انتہائی سطحی اور افسوسناک ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے علوم سے دور رہنے کی ہدایت دی ہے جو امت کیلئے ہلاکت کی کالی گھٹائیں لیکر وارد ہوں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **سلوا اللہ علما نافعا وتعوذوا من علم لاینفع** ۔[1] یعنی: اللہ تعالی سے علم نافع طلب کرو اور ایسے علم سے پناہ مانگو جو (تمہارے لئے) نفع بخش نہ ہو۔ یونہی ایک دوسری حدیث کا جز ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **ان من العلم جھلا** ۔[2] یعنی: بیشک علم کی ایک قسم جہل بھی ہے۔

سیرت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ لمبی باتیں کرنے اور باتوں کے اندر زیادہ خامیاں تلاش کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے، بلکہ باتوں میں معقولیت کو پسند کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کثیر احادیث وارد ہوئی ہیں جن کا ذکر خوف طوالت کی وجہ سے ترک کیا جا رہا ہے۔ یونہی اہل بدعت کی باتوں کو رد کرنے کے لئے ان ہی کی طرح انداز اختیار کرنے یعنی علم کلام اور علوم عقلیہ کے ذریعے دلیلیں قائم کرنے کو بھی امام احمد اور دیگر آئمہ حدیث مثلاً یحی قطان اور ابن مہدی وغیرہ ناپسند کرتے تھے۔ ان حضرات کا موقف یہ تھا کہ اگر قرآن وسنت کے نصوص اور اعیان امت کے کلام کے ذریعے ان لوگوں کی باتوں کا جواب دیا جانا ممکن ہو تو دیا جائے ورنہ ان کے معاملے میں سکوت ہی بہتر ہے۔ اس ضمن میں ابن مبارک وغیرہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: **لیس اھل السنۃ عندنا من در علی اھل**

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الدعوات، باب ما تعوذ منہ رسول اللہ علیہ وسلم۔

2۔ سنن ابی داوٗد، کتاب الادب، باب ماجآء فی الشعر۔

الھواء بل من سکت عنھم ۔یعنی: ہمارے نزدیک وہ اہل سنت ہی نہیں جوان بوالہوسوں کی تردید پر اپنی توانائی صرف کرتا رہے بلکہ اہل سنت تو وہ ہے جوان (کی لن ترانیوں) پر خاموشی اختیار کرلے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نفسانیت کے ان پجاریوں کی تردید کی جانے لگے تو اس کے لئے لامحالہ علوم عقلی کی ضرورت ہوگی اور جب ہم ان عقلی علوم کی تحصیل میں مشغول ہو جائیں گے تو اصل علوم نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصول اوران پرعمل کی راہ میں کافی ساری رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی ،حالانکہ یہی علم ہماری اساس ہے اور ہمارے لئے کافی ہے اور جس کے لئے یہ علم کافی نہیں، خدا بھی اس کے لئے کافی نہیں۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ جنگ وجدال کے شائق حضرات میرے اس رسالے میں شدید تنازع اور اعتراضات قائم کریں گے،لیکن یادرکھیو! جب حق واضح ہوجائے تو اس کی اتباع واجب ہوجاتی ہے اورحق کے ماسواہر طرح کے شریر، نافرمان، ترش رواورفسادی سے دوری بنائے رکھنا راہِ حق کے ہرراہی پرلازم ہوجاتا ہے۔

اب تک کی گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ امام احمد اوروہ آئمہ ذی احترام جنہوں نے امام احمد کی ہموار کی ہوئی راہ حق کو اپنے لئے منتخب کیا، لاریب علم وفن اور فضل وکمال کے اعتبار سے وہ مبارک حضرات بڑے عظیم الشان جلیل القدر اور رفیع المرتبت تھے ۔لہذا اس میں کوئی شک نہیں کہ امام احمد بن حنبل کا مذہب ہر اس شخص کے لئے کافی و وافی ہے جسے اللہ کریم حق کی طرف راہیاب کرنا چاہے،اورجس کی تقدیر میں اللہ نے روشنی ہی نہیں رکھی ، بے شک اس کے لئے کوئی روشنی کافی نہیں۔